رسائل و مسائل

تفہیم القرآن پر چند اعتراضات

سوال ۔ میں قرآن شریف کا چند تفسیروں کے ذریعہ مطالعہ کر رہا ہوں پہلے جناب کی تفسیر تفہیم القرآن کا مطالعہ کرتا ہوں ۔ پھر تفسیر جلالین، تفسیر خازن اور دیگر مختلف تفاسیر کا بھی مطالعہ کرتا ہوں بعض مقامات پر آپ قدیم مفسرین سے کافی اختلاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس سے طبیعت میں شبہات پیدا ہو جاتے ہیں ۔ میں چند اختلافی مقامات پیش کرتا ہوں ۔ توقع ہے کہ آپ تسلی بخش جواب تحریر فرمائیں گے ۔

(۱) تفہیم القرآن جلد اول میں حروف مقطعات کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ اُس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا ۔ خطیب اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے ۔ آپ کا یہ قول جمہور مفسرین کے خلاف ہے تفسیر مدارک اور معالم میں ہے : اللہ اعلم بمرادہ اشارۃً الیٰ ما اختارہ جمہور السلف والخلف ان الحروف المقطعة من المتشابہات التی لا یعلم تاویلہٗ الا اللہ کما قال الشعبی وجماعةٌ الف ل م وسائر حروف الهجاء فی اوائل السُّوَر من المتشابه الذی استاثر اللہ تعالیٰ

بقیہ امریکی دستور

ان دقتوں کا کوئی حل نہ ہے ، نہ امریکی دستور پر فریفتگی کا اظہار کرنے والوں نے اس طرح کے مسائل کو کبھی سوچا ہوگا ۔ ان کی تو نگاہیں غیر محدود اختیارات پر کھپ کر رہ گئی ہونگی ۔ ہاں ! اگر ان کا حل نکل آئے تو اسلامی اصول اسی طرح اس ڈھانچے میں کام کر سکتے ہیں جس طرح وہ کسی دوسرے ڈھانچے میں کر سکتے ہیں ۔

لعلمہ وھو سرّ القرآن فنحن نؤمن بظاھرھا ونکل العلم الی اللہ وفائدۃ ذکرھا طلب الایمان بھا قال ابوبکر الصدیقؓ فی کل کتاب سرٌّ وسرُّ اللہ تعالیٰ فی القرآن اوائل السُّوَر۔ حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ بھی اسی طرح فرماتے ہیں۔ آپ کے خیال کے مطابق اگر اُس وقت حروفِ مقطعات کا استعمال ہوتا تو حضرت صدّیق اکبرؓ اور حضرت علیؓ ضرور ان کا مطلب بیان فرماتے۔ عبارت مذکورۂ بالا سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام سلف و خلف ان حروف کا علم اللہ کے سپرد کرتے تھے۔ جب صحابہ نے ان کا کوئی معنیٰ متعین نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ اُس وقت بھی ادبا و شعراء ان حروف کو آپ کے خیال کے مطابق استعمال نہیں کرتے تھے۔ ہاں البتہ بیضاوی نے ایک دلپسند بات لکھی ہے کہ حروفِ مقطعات میں مشرکینِ مکہ کو تحدّی ہے کہ یہ وہی حروف ہیں جن سے تم اپنے کلام مرکب کرتے ہو اور انہی حروف سے یہ کتاب اللہ بھی مرکب ہے۔ مگر اس کے باوجود تم ایسا کلام بنا کر نہیں لا سکتے۔

(۲) رفعِ مسیح الی السماء میں بھی آپ نے مفسرین سے اختلاف کیا اور رفع کے مفہوم کو ابہام میں ڈال دیا۔

(۳) اصحابِ کہف کے متعلق جبکہ ان کے غار میں سونے کی مدت قرآن میں صریحاً مذکور ہے آپ نے تاریخ پر اعتماد کرتے ہوئے تفاسیرِ قدیمہ بلکہ قرآن کے بھی خلاف لکھا ہے۔

(۴) وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ کی آپ نے جو تفسیر فرمائی ہے وہ بھی مفسرین کے خلاف ہے بلکہ قرآن کے بھی خلاف ہے کیونکہ قرآن میں دوسری جگہ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ کے الفاظ نے آپ کی تفسیر کی واضح تردید کر دی ہے۔

(۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعۂ ہجرت جبکہ ان کی بیوی ان کے ساتھ تھی اور ایک ظالم بادشاہ نے بدفعلی کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس ظالم کو اپنی قدرتِ قاہرہ کے ساتھ اس ارادہ سے باز رکھا، آپ نے یہاں بھی اختلاف کیا ہے اور اس واقعہ کو لغو قرار دیا ہے۔

آپ ان مقامات پر نظرِ ثانی فرمائیں یا اپنے خیالات سے رجوع فرمائیں یا مُسکت دلائل تحریر فرمائیں۔

کریں۔ آپ کے مخالفین، خدا انہیں ہدایت دے، ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

جواب۔ آپ کے سوالات کے جوابات نمبر وار حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حروف مقطعات کے بارے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کی بنیاد دو امور پر ہے۔ اول یہ کہ نزول قرآن کے زمانہ میں کفار نے ہر طرح کے اعتراضات کیے مگر یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ اس قرآن میں یہ حروف کیسے ہیں جن کا کوئی مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ ان کو یہ بات تو مطمئن نہیں کر سکتی تھی کہ یہ متشابہات ہیں جن کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ مومنین صحابہ تو اس پر مطمئن ہو سکتے تھے، مگر کفار کیسے مطمئن ہو جاتے؟ لامحالہ اس کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے کہ طرح طرح کے اعتراضات چھانٹنے والے لوگوں نے اس پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دوم یہ کہ عرب کے خطبات اور اشعار میں اس طرح کے حروف استعمال کرنے کی مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلوب ان کے ہاں رائج تھا، اور میرے نزدیک ان حروف پر کفار کے معترض نہ ہونے کی وجہ یہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض صحابہ کرام کے یہ اقوال روایات میں نقل ہوئے ہیں کہ ان حروف کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے۔ مگر روایات ہی میں بعض دوسرے صحابہ کے ایسے اقوال بھی تو ملتے ہیں جن میں ان کی تاویل بیان کی گئی ہے۔ رہا بیضاوی کا وہ ارشاد جسے آپ نے دل پسند قرار دیا ہے، تو میرا اس سے اطمینان نہیں ہوا۔ آپ کا اطمینان اگر ہو گیا ہو تو بہت اچھا ہے۔ مطلوب تو بہر حال قلب کا اطمینان ہی ہے۔ میں آپ کو خواہ مخواہ بے اطمینانی میں مبتلا کرنے کی کوشش کیوں کروں۔

(۲) رفع مسیح کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ رفع الی السماء کی تصریح نہیں کرتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس مفہوم کے محتمل بھی نہیں ہیں، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ محض ان الفاظ کی بنا پر قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن مجید رفع الی السماء کی تصریح کر رہا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی تفسیر میں ہم اُتنی ہی بات کہنے پر اکتفا کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے، یعنی "اللہ تعالیٰ نے ان کو اُٹھا لیا"۔ اس کے مختلف معانی میں سے کسی ایک کی تعیین قرآن سے باہر جا کر تو کی جا سکتی ہے مگر بہر حال اسے قرآن کی تصریح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس پر اگر آپ کو ابہام کی شکایت ہے تو ت

میں عرض کر چکا کہ اس قصے کے بعض دوسرے اجزاء بھی مبہم طریقے سے ہی بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک یہی امر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دشمنوں کی قید میں تھے اور انہوں نے آپ کو صلیب دینے کا فیصلہ کیا تو آخر وہ کیا صورت پیش آئی کہ وہ آپ کی جگہ کسی اور کو صلیب دے بیٹھے اور اس شبہ میں رہے کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو صلیب دی ہے۔ نہ صرف وہ بلکہ خود پیروانِ عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی شبہ میں پڑ گئے۔ کیا شُبِّهَ لَهُمْ کی کوئی تفصیلی کیفیت آپ کو قرآن میں کہیں ملتی ہے؟ اب، اگر ہم کسی بیرونی ذریعہ سے اس کی کوئی تفصیل بیان کریں تو ایسا کر سکتے ہیں۔ مگر یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ تفصیل خود قرآن بیان کر رہا ہے۔

(۳) اصحابِ کہف کے زمانۂ نوم کی مدت کے بارے میں میرے بیان پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے اس کا جواب آپ کو تفہیم القرآن ہی میں مل جاتا اگر آپ پورے قصہ کی تفسیر اس میں دیکھ لیتے۔ یہ تو آپ نے بڑی سخت بات کہہ دی کہ قرآن صریحاً مدت کی تعیین کر رہا ہے اور پھر بھی تم نے تاریخ پر یقین کیا اور قرآن کی تصریح رد کر دی۔ کیا آپ ایسے شخص کو مسلمان مان سکتے ہیں جو قرآن کو چھوڑ کر تاریخ پر ایمان لائے؟ میں تو ایک لمحہ کے لیے بھی اسے کافر قرار دینے میں تامل نہ کروں گا۔ اب ذرا آپ سورۂ کہف کی اس آیت پر غور فرمائیے کہ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا۔ کیا یہ دعویٰ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدتِ نوم کی تعیین ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا کا فقرہ بے معنی ہو جاتا۔

(۴) آیت وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ کے متعلق آپ کا اعتراض میں سمجھ نہیں سکا۔ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ کے حوالہ سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس آیت کی نہیں بلکہ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ کی تفسیر پر معترض ہیں۔ اگر بات یہی ہے تو براہ کرم تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۸۳ اور جلد دوم صفحہ ۹۵ کے حواشی اچھی طرح پڑھ کر بتائیے کہ آپ کو کس چیز پر اعتراض ہے۔

(۵) حضرت ابراہیم کے کذباتِ ثلٰثہ کے مسئلے پر میں نے دو جگہ بحث کی ہے۔ ایک رسائل و مسائل حصہ دوم صفحہ ۳۵ تا ۳۹۔ دوسرے تفہیم القرآن بسلسلۂ تفسیر سورۂ انبیاء، حاشیہ نمبر ۶۔ ان دونوں مقامات پر میں نے وہ دلائل بھی بیان کر دیے ہیں جن کی بنا پر میں اس روایت کے مضمون کی صحت تسلیم کرنے میں

متأثر ہوں۔ اگر میرے ان دلائل کو دیکھ کر آپ کا اطمینان ہو جائے تو اچھا ہے، اور نہ ہو تو جو کچھ آپ صحیح سمجھتے ہیں اسی کو صحیح سمجھتے رہیں۔ اس طرح کے معاملات میں اگر اختلاف رہ جائے تو آخر مضائقہ کیا ہے۔ آپ کے نزدیک حدیث کا مضمون اس لیے قابلِ قبول ہے کہ وہ قابلِ اعتماد سندوں سے نقل ہوئی ہے اور بخاری، مسلم، نسائی اور متعدد دوسرے اکابر محدثین نے اسے نقل کیا ہے۔ میرے نزدیک وہ اس لیے قابلِ قبول نہیں ہے کہ اس میں ایک نبی کی طرف جھوٹ کی نسبت ہوتی ہے اور یہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے کہ چند راویوں کی روایت پر اسے قبول کر لیا جائے۔ اس معاملہ میں میں اُس حد تک نہیں جاتا جہاں تک امام رازی گئے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ "انبیاء کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ اس روایت کے راویوں کی طرف اسے منسوب کیا جائے" (تفسیر کبیر، جلد ۶، صفحہ ۱۱۳) اور یہ کہ جب نبی اور راوی میں سے کسی ایک کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنا پڑ جائے تو ضروری ہے کہ وہ نبی کے بجائے راوی کی طرف منسوب کیا جائے" (تفسیر کبیر جلد ۷، صفحہ ۱۴۵)۔ مگر میں اس روایت کے ثقہ راویوں میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں کہتا کہ انہوں نے جھوٹی روایت نقل کی ہے، بلکہ صرف یہ کہتا ہوں کہ کسی نہ کسی مرحلے پر اُس کو نقل کرنے میں بے احتیاطی ضرور ہوئی ہے، اس لیے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ محض سند کے اعتماد پر ایک ایسے مضمون کو آنکھیں بند کر کے ہم کیسے مان لیں جس کی زد انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر پڑتی ہے۔

میں اُن دلائل سے بے خبر نہیں ہوں جو اس روایت کی حمایت میں اکابر محدثین نے پیش کیے ہیں، مگر میں نے ان کو تشفی بخش نہیں پایا ہے۔ جہاں تک بل فعلہ کبیرھم ھذا اور انی سقیم کا تعلق ہے، ان دونوں کے متعلق تو تمام مفسرین و محدثین اس پر متفق ہیں کہ یہ حقیقۃً جھوٹ کی تعریف میں نہیں آتے۔ آپ تفسیر کی جس کتاب میں چاہیں ان آیات کی تفسیر نکال کر دیکھ لیں۔ اور ابن حجر، عینی، قسطلانی وغیرہ شارحینِ حدیث کی شرحیں بھی ملاحظہ فرمالیں۔ کسی نے بھی یہ نہیں مانا ہے کہ یہ دونوں قول فی الواقع جھوٹ تھے۔ رہا بیوی کو بہن قرار دینے کا معاملہ تو یہ ایک ایسی بے ڈھب بات ہے کہ اسے بنانے کے لیے محدثین نے جتنی کوششیں بھی کی ہیں وہ ناکام ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اس بحث کو جانے دیجیے کہ جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے اُس وقت حضرت سارہ کی عمر کم از کم ۶۵ سال تھی اور اس عمر کی خاتون پر کوئی